Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق

گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاولپور

Year 2025; Vol 04 (Issue 01)

P. 95-107 https://journals.gscwu.edu.pk/

روبینہ شاہین

پی ایچ ڈی سکالر (شعبۂ اردو)، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

Rubina Shaheen

(Ph. D. Scholar), Department of Urdu, G. C. Women University Sialkot

انتظار حسین کے فکشن میں وجودیت

Existentialism in Intizar Hussain's Fiction

Abstract:

Existentialism is essentially the philosophy of human existence. It views human life as fundamentally unique, self-aware, and constantly engaged in self-reflection. This philosophy emerges from the individual's inner conflicts and personal struggles. The experiences of war, social unrest, and rapid industrial growth have filled literature with existential concerns such as fear, psychological confusion, lack of belonging, alienation, isolation, moral and spiritual decay, meaninglessness, and even a longing for death.

In the backdrop of the Partition and the resulting political and social instability, these existential traits strongly appear in Intizar Hussain's fiction. The characters in his narratives often suffer from existential anxiety, inner torment, and a deep sense of guilt. They grieve not only the loss of personal identity but also the disintegration of collective or national identity. His stories depict an atmosphere marked by helplessness, despair, stagnation, and emotional paralysis.

Key Words: Existentialism, Intizar Hussain, isolation, identity crisis, anxiety, suffering, despair, inertia

مغرب کے جدید فلسفیانہ تصّورات میں فلسفۂ وجودیت فرد کے وجود کے پیچیدہ اور لاینحل مسئلے کی ایک نئے نقطۂ نظر سے عکاسی کرتا ہے۔وجودیت کے بانی سورین کرکیگارڈ(Soren Kierkegaard 1813-1855) کے مطابق وجود بے نظیر اور تطابق سے ممیز ہے۔یہ خود شناسی اور خداشناسی کا مرجع ہے اور سدا بہترین کے حصول میں سرگرداں رہتا ہے۔ خدااور انسانی وجود ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ان افکار کے سبب کرکیگارڈ اور اس کے پیرو، مارٹن ہو، جیزز، جبریل مارسل اور رچرڈ کرونز وجودیت کے مذہبی گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غیر مذہبی گروہ کا پیش رو ژاں پال سارتر(Jean-Paul Sartre 1905-1980)ہے۔اس کے مطابق انسان کا وجود اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔ وہ خود اپنی تقدیر کا خالق اور کارساز ہے اور خدا کا وجود بلاضرورت اور بلاجواز ہے۔ سارتر کے پیروکاروں میں نطشے، پاسکل اور ہیڈگر کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

فرنینڈو مولینا (Fernando Molina)وجودیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "The kind of philosophy which strives to analyze the basic structures of human existence calling individuals to an awareness of their existence in its essential freedom."(1)

فلسفۂ وجودیت انفرادی زندگی کی اہمیت پر اصرار کرتا ہے جو اپنے تمام تر شعور، آگہی، داخلی کیفیت، ذاتی جذبات و احساسات وغیرہ کے ساتھ آزادانہ طور پر بسر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تجریدی فکر عہدِ حاضر کی صنعتی زندگی اور تکنیکی پھیلاؤ کا مخالف بھی ہے۔وجودی مفکر یہ باور کرتے ہیں کہ مجرد فکر نے فرد کی انفرادیات پر شدید ضرب لگائی ہے اور اسے اپنے مسائل سے چشم پوشی پر مائل کیا ہے۔ اسی طرح صنعتی اور مشینی زندگی نے انسان کو مشین کا غلام بنادیا ہے اور وہ مشین کا ایک پرزہ بن کر اپنی تمام تر انسانی خُو بُو سے محروم ہو چکا ہے۔فلسفۂ وجودیت اشتراکیت اور فسطائیت کا بھی مخالف ہے اور ان سے برسرِ پیکار ہے کیونکہ کہ یہ دونوں ہی اجتماع کے سامنے فرد کی زندگی کو سلب کرنے کے درپے ہیں۔ہم کہ سکتے ہیں کہ فلفۂ وجودیت اس عہد کے مروجہ فلسفے صنعتی اور مشینی زندگی اور مخصوص سیاسی، سماجی اور اخلاقی صورتحال کے خلاف ایک احتجاجی آواز ہے۔

بقول ڈیوڈ ای رابرٹسن(David E. Robertson) :

> "This movement fights against those intellectual and social forces which cripple, stifle or destroy freedom. It reminds men of their most basic inner problems and calls them away from stifling abstractions and automatic conformity."(2)

وجودیت داخلی زیر و بم اور کشاکش پر مبنی تحریک ہے۔ تاہم، فرد کی سماجی زندگی قدم قدم مزاحمت و مخالفت سے عبارت ہے۔ انسانی زندگی تکنیکی ترقی کی آسائشوں کے ساتھ ساتھ پیچیدہ مسائل سے بھی دوبدو ہے جو اس کی باطنیت کو شدید متاثر کرتے ہیں۔ ایسے مسائل میں انسانی وجود کی معدوم ہوتی شناخت، ذات کی تلاش کا مسئلہ، اخلاقی وروحانی قدروں کا زوال اور اس کا افسوس، انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور اس کا کرب، احساس تنہائی، محرومی و مایوسی، احساس شکستگی اور عدم تحفظ کا مسئلہ، معاشرہ کی سطحیت و بے معنویت اور اس کا کھوکھلا پن، فرد کی مجہولیت، اس کی بے چہرگی، بے بسی، مجبوری ولاچاری، بے سمتی، ڈر اور خوف کی نفسیات، ذہنی انتشار، جنسی وجذباتی گھٹن، روحانی کرب، اجنبیت وبیگانگی، خواہش مرگ، زندگی کی لغویت اور لاحاصلیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس تحریک نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس لیے جدید افسانہ نگاروں نے انسان کے ظاہری یا سماجی پس منظر کے بجائے اس کے اندرون سے موضوعات کو منتخب کرنا پسند کیا۔ گویا جدید افسانہ نگاروں نے براہ راست سماجی اور سیاسی حالات کو موضوع نہیں بنایا، بلکہ سماجی اور اقتصادی حالات کے جو اثرات انسان کے باطن پر پڑے ہیں، اس کو موضوع بنایا۔

اردو ادب میں وجودیت کو موضوع بنانے والے مصنفین میں انتظار حسین کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ **ان** کے افسانوں میں خوف، دہشت، کرب، نیستی، ناامیدی، وسوسے اور اضطراب کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ’’کایاکلپ‘‘ ، ’’ٹانگیں‘‘ ، ’’سیڑھیاں‘‘ اور آخری آدمی‘‘ اہم افسانے ہیں۔ ’’کایاکلپ‘‘ میں مصنف نے داستانوی انداز میں خوف و دہشت کی فضا تخلیق کرتے ہوئے انسان کے وجودی زوال کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار شہزادہ آزاد بخت شہزادی کو سفید دیو کی قید سے نجات دلانے کی خاطر قلعے میں داخل ہوتا ہے۔ شہزادی اسے دیو کے غضب سے بچانے کے لیے سحر کے زور پر رات کو مکھی بنا دیتی ہے اور دن میں سحر پھونک کر دوبارہ آدمی بنا دیتی ہے۔ دن بھر شہزادہ، شہزادی کی محبت کا دم بھرتا ہے اور عیش و عشرت میں پڑ کر اصل مقصد بھول جاتا ہے۔ وہ اپنا نام، خاندان، آباؤاجداد اور وطن سب فراموش کر دیتا ہے:

> ''شہزادہ آزاد بخت مکھی بن گیا۔ شہزادہ آزاد بخت نے پہلے اس بات کو ایک خواب جانا، مگر صبح ہوتے ہوتے یہ خواب وہ بھول چکا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ جب شام ہوئی اور دیو گرجتا برستا قلعہ میں داخل ہوا تو وہ سمٹا چلا گیا۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہ تھا۔ پھر شہزادی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا۔ لیکن شام ہونے پر پھر وہی ہوا۔ پھر دیو چیختا چنگاڑتا قلعہ میں داخل ہوا۔۔۔مانس گند، مانس گند۔۔۔اور یہ آواز سن وہ خوف سے سمٹتا چلا گیا۔''(3)

شہزادے کی خود غرضی، ہوس، حرص اور طلب اسے بزدل بنا دیتی ہے اور اس میں دیو سے لڑنے کی ہمت نہیں رہتی اور وہ جو پہلے پہل دیو کے خوف سے مکھی بنتا تھا، مکھی کی جون میں مگن رہنے لگا اور بالآخر وہ مستقل طور پر مکھی بن گیا اور شہزادی کے منتر پھونکنے سے بھی آدمی کی جون میں نہ آیا۔ خوف و وحشت اور بزدلی کے سبب اس کی شخصیت زوال پذیر ہو گئی۔ بقول گوپی چند نارنگ:

> ''انتظار حسین کی مذکورہ کہانی 'کایا کلپ' 'خوف کی نفسیات کو پیش کرتی ہے اور خوف و دہشت کے فشار سے انسانی شخصیت کس طرح پچک جاتی ہے۔ اس کیفیت کو تمثیلی سطح پر پیش کرتی ہے۔''(4)

افسانہ ''آخری آدمی'' کے کردار بھی اپنی گوناگوں داخلی کیفیات، خوف، وحشت، غصّہ و اضطراب کے سبب آدمی سے بندر کی جون اختیار کر لیتے ہیں۔ تاہم، کہانی کا مرکزی کردار الیاسف اپنی باطنیت کی روشنی میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی خاطر تمام امکانات کی جدوجہد کرتا ہے۔ امید، حوصلے، لگن اور اعتماد سے اپنے آپ کو منوانے اور خودی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر منفی قوتوں کے دام میں آکر مقامِ بلند حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے اور انسان سے بندر بن جاتا ہے۔ اس کہانی کا پس منظر جدید معاشرتی زندگی کے بجائے اسلامی اساطیری حوالہ رکھتا ہے۔ تاہم افراد کے رویے اور داخلی کیفیات و احساسات دائمی ہیں جو فرد کے وجود اور زندگی کو زوال پذیر کر دیتے ہیں۔ افسانہ ''سیڑھیاں'' میں بھی انتظار حسین نے باطنی خوف کی تصویر کشی نہایت عمدگی سے کی ہے۔ کہانی کا ایک نوجوان کردار ذہنی الجھنوں اور خوف کا شکار ہے۔ اس کے والد نے حصار نہیں کھینچا جس کے سبب وہ عدم تحفظ کی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بے یقینی، وسوسے، بے نام پریشانیاں، بے آرامی اور اضطراب اس کی طبعیت میں در آتا ہے۔ ماضی کے دن اور توہمات کا خوف اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ ان قصّوں کو فرضی سمجھتا ہے مگر ان سے خوف زدہ بھی ہے۔

وجودی بیگانگی، اجنبیت اور تشکیک انتظار حسین کے افسانوی ادب کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کے اکثر افسانے، جیسے کہ " نر ناری"، "اندھی گلی"، "پرچھائیں"، "زرد کتا"، "ٹانگیں"، "سفر منزلِ شب"، اور "مشکوک لوگ" ان کیفیات کے مظہر ہیں۔ افسانہ "پرچھائیں" خود بیگانگی اور اجنبیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار حسن کو ایک اجنبی گھر اور پھر کالج میں ملنے آتا ہے لیکن وہ عدم موجودگی کے باعث مل نہیں پاتا۔ پھر وہ اسے ہر جگہ تلاش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اسے شک اور وہم ہونے لگتا ہے کہ جیسے اسے کوئی ڈھونڈ رہا ہے یا وہ خود کو ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ خود سے بے خبر اور دوسروں سے اپنا پتہ پوچھتا ہے:

> " چلتے چلتے اسے کچھ وسوسہ ہوا آن کی آن میں ایک تصوّر سا بندھ گیا۔ جیسے اسے کوئی ڈھونڈ رہا ہے اور وہ کمرے کمرے چھپتا پھر رہا ہے۔ جسے تیری تلاش ہے وہ خود تجھے ڈھونڈ لے گا۔ میری کس کو تلاش ہے؟ آخر کس کو؟ کیوں، وہ کون ہے؟ میں کون ہوں؟"(5)

تقسیمِ ہند کے بعد سیاسی، سماجی اور مذہبی تشکیک سرحد کے دونوں پار انسانی تعلقات میں بے گانگی اور اجنبیت کا سبب بنی۔ افسانہ "استاد" کا مرکزی کردار تقسیم کے بعد ہندوستان میں ہی رہ گیا لیکن اب استاد کی پہچان اجنبیت کا شکار ہو چکی ہے۔ عوام الناس جو عزت سے اس کے ہاتھ چومتے تھے اب اس سے بیگانہ اور لاتعلق ہیں۔ مفاد پرستی نے باہمی رشتوں میں دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔

بے اعتمادی تشکیک کا سبب بنتی ہے۔ بے اعتمادی اور تشکیک سماجی، سیاسی، معاشی ماحول کی دین ہے۔ جدید انسان شک کے چنگل میں اس بری طرح گرفتار ہے کہ اسے اپنے پرانے سب مشکوک نظر آنے لگے ہیں۔ "سفر منزل شب" میں پانچ دوست، ہاشم، حیدر، عبید، حمید اور حبیب دور دراز کا سفر کر کے ایک جگہ اکھٹے ہوتے ہیں تو چاروں دوست حبیب کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا تو بھی؟ حبیب کی خاموشی انہیں مذید شک میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بنابریں حبیب ان سے رخصت ہو جاتا ہے اور حیدر باقی چاروں کو بھی اس کے ساتھ شریک قرار دیتا ہے۔ جس پر ہاشم اسے بھی مشکوک قرار دیتا ہے اور فاتحانہ انداز میں بولتا رہتا ہے۔ صبح دم ہاشم بھی عبید اور حمید کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے:

> " کوئی چپ ہونے پر مشکوک ٹھہرا، کوئی بول پڑنے پر۔ کسی پر شک کی خبر سن کر اتنا بوکھلا کیوں گیا؟ کسی پر شک کی خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا؟ کسی کے باخبر

ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتا چل جاتا ہے؟ کسی کی بے خبری نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بے خبر نہیں بن رہا۔"(6)

آخر میں عبید اور حمید بھی ایک دوسرے پر شک کرنے لگ جاتے ہیں کہ مبادا دوسرا اسے چھوڑ جائے اور وہ تنہا رہ جائے۔ اسی شش و پنج میں دونوں رات بھر بے خواب رہتے ہیں۔ انتظار حسین نے اس کہانی میں شک کی مختلف کیفیات اور وجوہات کو دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوی ادب میں خوابناک فضا محسوس ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار خوابوں کے وسیلے سے حقیقت کی منازل طے کرتے معلوم ہوتے ہیں اور حال سے ماضی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ "اندھی گلی"، "چیلیں"، "اپنی آگ کی طرف"، "سیڑھیاں" وغیرہ میں انہوں نے ایسی ہی فضا تخلیق کی ہے۔ "آخری آدمی" کے افسانے اساطیری اور دیومالائی انداز کے سبب خوابناک فضا کے حامل ہیں۔ یہ ایسی خوابناک فضا ہے جس کے لیے مصنف کو کسی قسم کے منطقی استدلال کی حاجت نہیں رہتی۔ بقول سجاد باقر رضوی:

"یہ افسانے بھی منطق کی زنجیروں سے آزاد ہیں لیکن خوابوں کی اپنی منطق ہوتی ہے جو خواب دیکھنے والے کے کردار کے حوالے سے بامعنی بنتی ہے۔ اس طرح انتظار حسین کی کہانیاں جو غیر منطقی واقعات سے پُر ہیں اس کے اپنی وژن کے حوالے سے اپنی معنویت کا ابلاغ کرتی ہیں۔"(7)

"سیڑھیاں" میں خواب اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ افسانے کے چار کردار بشیر بھائی، رضی، اختر اور سید ایک دوسرے کو اپنے خواب سناتے ہیں۔ اختر کو خواب میں مردے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک خواب میں نانا مرحوم مسجد سے نکلتے وقت پیڑوں کے دونے میں سے ایک پیڑا اختر کو دیتے ہیں۔ رضی کو خواب میں امام باڑہ اور چاندی کا بڑا علم دکھائی دیتا ہے۔ سید کو بہت عرصے سے کوئی خواب دکھائی نہیں دیا۔ وہ اپنے ماضی میں دیکھے خوابوں اور خواب جیسی کیفیت کے حامل واقعات کو یاد کرتا ہے۔ تاہم، ایک خوابناک فضا اس کے خوابوں کو گڈ مڈ کر دیتی ہے اور اسے اپنے خواب گزرے ہوئے وقت کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں:

"ہم کنویں میں جھانکنے لگے۔۔۔ چمکتے ہوئے پانی پر ایک عکس تیر رہا تھا۔ "پتنگ"، میں نے نظر اوپر کی۔ ایک بہت بڑی ادھ کٹی پتنگ، آدھی کالی آدھی سفید کٹ گئی تھی۔۔۔

> میں نے ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھوں میں سے نکلتی چلی گئی۔ میں تیر کی طرح زینے میں دوڑا۔۔۔ ایک موڑ، دوسرا موڑ، سیڑھیاں، پھر سیڑھیاں، اس کے بعد پھر سیڑھیاں۔۔۔ جیسے چڑھتے چڑھتے صدی گزری ہو۔۔۔ پھر کھلا زینہ آگیا، مگر سیڑھیوں کا پھر وہی چکر، سیڑھیاں، اور پھر سیڑھیاں اور پھر۔۔۔"(8)

جان لیوا جبر اور لایعنیت انتظار حسین کی تمثیلی کہانیوں "رات" اور " وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" میں دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ "رات" میں یاجوج ماجوج دیوار چاٹنے کی لایعنی سعی کے چکر کا شکار ہیں۔ وہ دیوار چاٹنے کے کارِ بے کار کے چنگل سے نکل نہیں پاتے۔ دنیا کا جغرافیہ تبدیل ہو جاتا ہے، لوگ نئی دیواریں بنا لیتے ہیں۔ لیکن وہ لاحاصل اور بے فائدہ عمل میں زندگی گزار دیتے ہیں: "ہم تو دیوار کو نہ چاٹ سکے، دیوار نے ہمیں چاٹ لیا"۔(9)

انتظار حسین کے افسانے " چیلیں" میں بدبخت گروہ کے افراد بے اعتبار سمندروں میں صدیوں کی مسافت طے کر کے جزیرے پر پہنچتے ہیں تو انسان نما چیلیں ان کے دستر خوان پر یلغار کر دیتی ہیں اور وہ ان چیلوں کو مارنے میں ناکام رہتے ہیں: "لڑنے والے کو یہ پتہ ہو کہ وہ کس سے لڑ رہا ہے تب وہ لڑتا ہے۔ یہاں تو مجھے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ یہ مخلوق کون سی ہے۔"(10) ان کے پاس اس جزیرے سے نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ یوں ان کا صدیوں کا سمندری سفر لایعنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ انتظار حسین زندگی کی لایعنیت پر اصرار کرتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی سعی لاحاصل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ من چاہی زندگی کی آس میں تمام عمر گزار دیتا ہے مگر آزادی سے محروم رہتا ہے۔ اس کے خمیر میں قید و بندش کا مادہ اتنا قوی ہے کہ وہ صبح و شام ایک ہی طرح کی سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی تنوع، ارتفاع اور ارتقاء نہیں۔ وہ زندگی کی حرارت سے محروم ہے۔ فقط اس کی مقررہ حرکات اس کی زندگی کا نشان ہیں۔

نارسائی کا کرب انتظار حسین کے افسانے "دیوار" میں نظر آتا ہے۔ اس کہانی کی فضا لاحاصلی، تجسس اور تحیر کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ دیوار کے دوسری جانب جو کچھ ہے اس تک رسائی حاصل کرنے کی دھن میں کتنے ہی دیوار پر چڑھے اور قہقہے لگاتے دوسری طرف اتر گئے۔ مندریس بھی دیوار کا بھید پانے کے لیے دیوار پر چڑھا لیکن نارسائی کے کرب کی نذر ہو گیا: "مندریس نے ایک شوقِ فضول میں اپنے وجود کو کتنا مضحکہ خیز بنا لیا ہے کہ وہ آدھا اِدھر پڑا ہے، آدھا دیوار کے اس طرف۔"(11)

انتظار حسین کے کردار بند دروازے اور اندھی گلی میں نارسائی کے کرب سے گزرتے ہیں۔"اندھی گلی" کے ارشد اور نعیم پیلی حویلی تک پہنچنے کے لیے گلیوں کے گورکھ دھندے میں الجھ جاتے ہیں اور بار بار گلی کی دیوار ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے:

"۔۔۔انہوں نے ڈرتے ڈرتے باہر جھانک کر دیکھا اور کسی کو نہ پا کر باہر نکل آئے۔ دو قدم بڑھ کر ٹھٹھکے۔ دیوار راستہ روکے کھڑی تھی۔ ارے ہم تو پھر اسے اندھی گلی میں آگئے۔"(12)

آزادی اور انتخاب کو فلسفۂ وجودیت میں سارتر نے بہت اہمیت دی ہے۔ فرد کو اپنی راہیں متعین کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے۔ تاہم، ارادے کی کمزوری و بے چارگی فرد کی انفرادی صلاحیتوں کو ماند کر دیتی ہے۔ امکانات، خواہشات اور خدشات بے عملی کو فروغ دے کر وجودی کمزوری کو ہوا دیتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانے "ہمسفر" کا کردار "وہ" بے چارگی اور پچھتاوے کا شکار ہے۔ وہ غلط بس میں چڑھ جاتا ہے اور بار بار اگلے سٹاپ پر بس سے اتر جانے اور صحیح بس پکڑنے کا فیصلہ کرتا ہے مگر ارادے کی کمزوری مانع ہوتی ہے اور اس اُدھیڑ بُن میں کئی سٹاپ گزر جاتے ہیں اور بالآخر وہ منزلِ مقصود سے قبل ہی بس سے اتر جاتا ہے۔ وہ اتر کر واپسی کی بس تلاش کرنا چاہتا ہے مگر احساس ہوتا ہے کہ مہلت ختم ہو گئی ہے اور واپسی کے راستے مسدود ہیں۔ انتظار حسین نے اس کہانی میں یہ واضح کیا ہے کہ اگر لمحہ انتخاب غلط ہو تو اس کے نتائج کو لمحہ آخر تک برداشت کرنا پڑتا ہے۔

موت کا خوف انسان کو مجبور اور بے بس کر دیتا ہے۔ موت زندگی کی ضد اور دعوتِ عمل کا شعور ہے۔ انتظار حسین کے افسانوی ادب میں کہیں تو زندگی، موت کا دوسرا روپ ہے، کہیں کوئی کردار جیتے جی مر جاتا ہے اور کہیں مر کر جی اٹھتا ہے۔ ان کے یہاں موت کے مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انسان بظاہر زندہ ہیں مگر داخلی طور پر وہ مرگ کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان کے حالات و اعمال نے انہیں زندہ در گور کر دیا۔ "شہرِ افسوس" کے کردار ایسی ہی موت کا تجربہ کرتے ہیں۔ وہ سیاہ بخت زندہ ہیں مگر ضمیر کے بوجھ تلے دب کر دم سادھے بیٹھے اس موت کا انتظار کر رہے ہیں جو باطنی طور پر واقع ہو چکی ہے۔ ہر چہرے پر موت کی پرچھائیاں رقص کر رہی ہیں۔ اگر کوئی شخص ہنس دیتا ہے تو باقی حیرت و خوف کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ موجود میں لاپتہ ہیں۔ زندہ ہیں مگر مر چکے ہیں:" پھر یہ کہ اے لاپتہ آدمی بیٹھ جا اور مت پوچھ کہ تو کہاں ہے اور جان

لے کہ تو مر گیا ہے۔"(13)انتظار حسین نے اس کہانی میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ایک باضمیر انسان کے لیے خود شناسی موت سے بدتر ہے۔

"ہڈیوں کا ڈھانچ" میں ایک کردار مر کر جی اٹھتا ہے اور اس کی بھوک اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ سارے شہر کی غذا کھا جاتا ہے۔ اس کی ندیدی آنکھوں کی ہوس سے کھانوں کے رنگ، خوشبو، ذائقے اور تازگی ماند پڑ جاتی ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو جیتے جی مر جاتا ہے لیکن بھوکے فقیروں کے لیے روٹیاں اکٹھی کر تا رہتا ہے۔ انسان کی ہوس قبر کی دیواروں تک اس کا پیچھا کرتی ہے۔ دوسروں کے حق غصب کرنے والے مر کر بھی لوگوں کے تصّور میں اپنی تمام تر خود غرضی اور لالچ کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔

وجودیت، عرفانِ ذات اور عرفانِ حقیقت پر زور دیتی ہے اور انتظار حسین نے انسانی وجود کے اس پہلو کی طرف منفرد انداز میں توجہ دلائی ہے۔ ان کے افسانوی ادب میں وجود اور ذات سے بے خبری اور شناخت کے کھو جانے کا نوحہ سنائی دیتا ہے۔ "خیمے سے دور"، "سفر منزلِ شب"، "وہ جو کھوئے گئے"، "وہ اور میں"، "شہادت"، اور "نرناری" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں کے کردار اپنی شناخت کے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ وہ اپنا نام، اپنی زمین، اپنی پہچان سے محروم ہیں۔ افسانہ "شہادت" کا کردار احمد علی عدالت میں دوسروں کی شناخت کا گواہ ہے مگر اپنی شناخت سے محرومی کے خوف کا شکار ہے کہ وہ کون ہے، کہاں سے ہے، اس کا نام کیا ہے، کہیں وہ اپنا نام تو نہیں بھول گیا:

> "تانگے میں بیٹھ کر اسے شریف کی بات کا خیال آیا، تو وہ اسے پکار رہا تھا اور اس نے سنا نہیں اور جب اس نے اس بات پر غور کیا تو وہ شک میں پڑ گیا کہ وہ اپنا نام تو نہیں بھول گیا۔"(14)

"نرناری" میں انتظار حسین نے بڑی فنی مہارت سے شناخت کے کھو جانے کے مسئلے کو بیان کیا ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار مدن سندری کے پتی دھاول اور بھائی دیول مندر میں بلی چڑھتے ہیں تو اس کی فریاد سن کر دیوی رحم کھاتی ہے اور دونوں کے سروں کو دھڑوں پر رکھنے کا حکم دیتی ہے۔ خوشی کے مارے مدن سندری بھائی کے جسم پر شوہر کا سر اور شوہر کے جسم پر بھائی کا سر جوڑنے کی غلطی کر دیتی ہے اور دونوں زندہ ہو جاتے ہیں۔ دھاول کو جب اس غلطی کا ادراک ہوتا ہے تو وہ اپنی شناخت اور وجود کے متعلق ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے اور مدن سندری کو لے کر جنگل میں دیوانند رشی (سنیاسی) کی خدمت میں حاضر ہو

تا ہے، جو یہ کہہ کر اس کی الجھن سلجھا دیتے ہیں: ”مورکھ! کس دبدا میں پڑ گیا۔ سو باتوں کی ایک بات تو نر ہے۔ مدن سندری ناری ہے۔ جا! اپنا کام کر۔“ (15)

اس افسانے کی دوسری تعبیر قومی حوالے سے بھی کی جا سکتی ہے کہ فرد جب اپنی زمین، تہذیب و ثقافت اور وجود سے کٹ کر کسی دوسری زمین اور تہذیب و ثقافت کا حصّہ بنتا ہے تو اپنی شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

> ” یہ مدن سندری کون ہے جو یوں وسوسے میں گھر گئی ہے؟ اس کے علامتی تفاعل پر نظر کیجیے تو کیا مدن سندری ایسا معاشرہ تو نہیں ہے جو Identity Crisis کا شکار ہو۔“(16)

افسانہ ”پرچھائیں“ بھی انفرادی تشخص کے ساتھ ساتھ قومی تشخص کی تلاش کا نوحہ ہے۔ جب افراد یا قوم کا رشتہ اپنی تہذیب و روایات کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے تو ان کا تشخص زوال پذیر ہو جاتا ہے اور وہ فقط پرچھائیاں بن جاتے ہیں:

> ” قافلہ جو گزر گیا اور پرچھائیاں بھٹک رہی ہیں۔ ہم گزرے ہوئے قافلے کی بھٹکی ہوئی پرچھائیاں ہیں۔ میں بھٹکی پرچھائیوں کے قافلے میں سے ایک بھٹکی ہوئی پرچھائیں ہوں، میں کس وہم کی سوچ ہوں؟ میں ہوں! ہر چند کہ ہوں، نہیں ہوں۔“؟(17)

”خیمے سے دور“ اور ”سفر منزلِ شب“ کے کردار ایسی صورتحال سے مغلوب ہیں کہ ان کی انفرادی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ ”خیمے سے دور“ کے بے نام کردار اس الجھن کا شکار ہیں کہ وہ خیمے سے نکلیں یا نہیں۔ وہ خوفزدہ ہیں کہ خیمے سے نکلے تو پہچانے جائیں گے۔ ان میں سے ایک خیمے سے نکل جاتا ہے مگر اپنی شناخت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ خیمہ ہی ان کی واحد شناخت تھا۔ ”سفر منزلِ شب“ کے کردار اگرچہ باضابطہ نام رکھتے ہیں تاہم، وہ اپنی شناخت کے بارے میں مشکوک ہیں۔ یہاں شبہ صرف دوسروں کی شناخت پر ہی نہیں، اپنی پہچان پر بھی ہے۔

انتظار حسین کی کہانیوں میں شدید احساسِ جرم موجود ہے۔ ان کے کرادروں کا احساسِ جرم ہی ان کے لیے سزا بن جاتا ہے۔ جیسے کہ ”شہر افسوس“ کے کردار اپنے اپنے جرائم کے سبب شدید ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ تاہم انتظار حسین نے اپنے ناول ” تذکرہ“ میں ایک پاکستانی سیاسی لیڈر کا جرم ثابت ہوئے بغیر دی جانے والی پھانسی کو کہانی کا حصّہ بنا کر کافکائی جرم کی فضا تخلیق کی ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں ابہام کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کہانی کا آغاز مبہم ہوتا ہے۔ منتشر خیالات و واقعات اس میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ایک واقعہ بیان کرتے کرتے دوسرے واقعات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے جن کا کہانی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ انہوں نے ''ٹانگیں'' کا آغاز چونگ زد کے خواب سے کیا ہے جس میں اس کی جون بدل جاتی ہے۔ اس بیان کے بعد یاسین کو چوان کا قصّہ شروع ہو جاتا ہے جس کا مذکورہ بالا بیان سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں جگہ جگہ استفہامیہ انداز اپنایا ہے۔ ایک کے بعد ایک سوال اور ایک بات سے دوسری بات پیدا کرنے پر وہ قدرت رکھتے ہیں۔ انتظار حسین نے افسانہ ''ٹانگیں'' اور "شہادت" میں یکے بعد دیگرے کئی سوالات اٹھائے ہیں۔ تاہم کہانیوں کے آغاز میں ابہامی کیفیت قاری کی سوچ کے دریچے وا کر دیتی ہے اور انجام تک پہنچتے پہنچتے آغاز کا یہ ابہام کئی نئے حقائق آشکار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ انتظار حسین کے ابہام کا سبب ان کی تخلیقات میں موجود رمزیت کا عنصر ہے جو بعض اوقات ترسیلِ ابلاغ میں رکاوٹ بنتا ہے کیونکہ ان کی علامت کثیر الجہت ہونے کے باعث مکرر مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ بسا اوقات ان کی تخلیقات کی متعدد تشریحات کے امکانات موجود ہوتے ہیں جن کی تفہیم کے لیے مصنف کی اشاراتی زبان کے عجیب و غریب عناصر کو اس کے ماخذ سے منسلک کرنا ضروری ہے۔

انتظار حسین کی تخلیقات میں اذیت و کرب کا بیان بدرجہ اُتم موجود ہے۔ اذیت و کرب کے یہ سلسلے عہد نامہ عتیق سے لے کر، واقعہ کربلا، جنگِ آزادی، دو عالمی جنگوں، تقسیمِ ہند، سانحہ مشرقی پاکستان، مسئلہ فلسطین اور پھر پے در پے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی طوائف الموکی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تمام کہانیوں میں اذیت اور آزردگی کی ایک مخصوص فضا چھائی ہوئی ہے جو ان کی کہانیوں کو ممتاز مقام دیتی ہے۔ ان کا لفظ لفظ غم و اندوہ اور کرب و اذیت کا بیان ہے۔ بقول نذیر احمد: '' انتظار حسین کا الم انگیز لب و لہجہ اس کے افسانوں میں بکھری پڑی چھوٹی چھوٹی تصویروں، مختصر فقرات سے بھی مترشح ہے۔''(18)

افسانہ ''آخری آدمی'' کا الیاسف بستی کے تمام افراد کے وجودی زوال پر کرب و اذیت کا شکار ہے۔ وہ اپنی وجودی شناخت کو برقرار رکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ وہ محبت، نفرت، غصّہ، ہمدردی، غم اور خوشی کے جذبات کی یلغار سے بچنے کی سعی کرتا ہے تاکہ اپنی انسانی جون برقرار رکھ سکے۔ وہ اپنی ذات میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن وسوسے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس کا داخلی کرب اسے رونے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ جو خود کو آدمیت کا جزیرہ تصّور کرتا تھا اس کے بنائے ہوئے پشتے میں شگاف پڑ جاتا ہے اور سمندری پانی جزیرے میں بہہ آتا ہے۔ وہ جھیل کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ ناکام مدافعت اور ناکام گریز کے کرب سے وہ چیخ اٹھتا ہے اور وہ بے تحاشا بھاگتا ہے اور بھاگتے بھاگتے اس کی کمر درد کرنے لگتی

ہے اور پشت کی ہڈی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر جانوروں کی مانند پیٹھ جھکا کر چلنے لگتا ہے۔ ''وہ جو کھوئے گئے'' ، ''شہر افسوس'' اور ''اندھی گلی'' کے کردار بے مقصد بھٹک رہے ہیں اور لا مقصدیت اور لاسمتیت کی اذیت کا شکار ہیں۔ ان کی بے منزلی کے کرب کا کوئی انت نہیں ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں رجائیت اور عزم وارادے کا فقدان ہے۔ ان کی کہانیوں کا بنیادی محرک خوف، وسوسہ، شک، جبر اور ناامیدی ہے جس میں کردار پھنستے چلے جاتے ہیں۔ نہ تو ان کے درد کا کوئی درماں ہے اور نہ ہی کوئی راہِ نجات ہے۔ عجیب لاچاری اور بے بسی کی صورتِحال ہے۔ ان کی اکثر کہانیوں میں ایسی ہی ناامیدی اور بے عملی کی فضا پائی جاتی ہے۔ افسانہ '' کشتی'' اور ''برہمن بکرا'' ایسی ہی صورتِحال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''کشتی'' میں کشتی تو ہے مگر نوح نہیں ہے، مچھلی کے بال سے کشتی بندھی ہوئی ہے مگر مچھلی غائب ہے۔ کشتی طوفانی لہروں پہ ڈول رہی ہے۔ کوئی اس کا کھیون نہیں۔ بچاؤ کی امید ٹوٹ چکی ہے۔ ''برہمن بکرا'' کا مرکزی کردار اپنے پچھلے تمام جنموں کو یاد کرتا ہے تو سوائے دکھ کے اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ اور وہ کرب کے ساتھ سوال کرتا ہے: '' ہے رام سکھ کون سی جون میں؟''(19)

ناامیدی کی یہی کیفیت افسانہ ''چیلیں'' میں بھی موجود ہے۔ طویل سمندری سفر کے بعد جہاز ایک جزیرے پر لگتا ہے مگر وہاں موجود انسان نما چیلیں ان کا انجام بخیر نہیں ہونے دیتیں اور اب جہاز کے مسافروں کو اپنے بچاؤ کی امید نظر نہیں آتی۔ انتظار حسین وجود کے مسئلے کی ایک فلسفی کی حیثیت سے عکاسی نہیں کرتے بلکہ اسے فن کی عبا میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں وجود کی ماہیت اور نوعیت کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھائے ہیں۔ ایسے افسانوں کا نمایاں وصف فرد کی تنہائی، دہشت و بیگانگی، ذات کے بحران کا کرب، اخلاقی و روحانی قدروں کی شکست وریخت، مشینی اور میکانکی زندگی کا اضطراب وغیرہ جیسے موضوعات کی پیش کش رہا ہے۔ ان کے افسانے "آخری آدمی" اور "کایاکلپ" منفی کیفیات، ہوسِ زر اور طمع دنیا کے تحت پیدا ہونے والے روحانی انحطاط کا المیہ ہیں۔ "رات"، "چیلیں" اور "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" دنیا کی مہملیت اور لغویت کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ "کایاکلپ" اور "سوئیاں" خوف ودہشت کی نفسیات اور وجود کے معدوم ہو جانے کو موضوع بناتے ہیں۔ افسانہ "دیوار" اور "اندھی گلی" نارسائی کا کرب بیان کر رہے ہیں۔ "ہمسفر" آزادی، انتخاب اور لاچاری کی داستان رقم کرتے ہیں۔ "ہڈیوں کا ڈھانچ" اور "ٹانگیں" خواہشات کے دباؤ کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی اخلاقی پستی کا بیان ہیں۔ "نرناری"، ''خیمے سے دور'' اور ''سفر منزلِ شب'' شناخت سے محرومی کا نوحہ ہیں۔ "پرچھائیں" "کٹا ہوا ڈبہ" "بیک وقت

مراجعت، وجودیت، مستقبلیت اور روایت کی داستان سناتے ہیں۔ "وہ جو کھوئے گئے" اور "شہر افسوس" میں وجود کے کھو جانے اور زندگی کی کربناکیوں کا نوحہ ہے۔ "کشتی" اور "برہمن بکرا" میں رجائیت اور عزم و ارادے کا فقدان ہے۔

حوالہ جات

1. فرنینڈو مولینا (Fernando Molina)"Existentialism as Philosophy"، (لنڈن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1959)، ص2
2. ڈیوڈ ای رابرٹسن (David E. Robertson) "Existentialism as Religious Belief"، (اینگل ووڈ کلف، نیوجرسی، پرینٹس ہال، 1969)، ص4
3. انتظار حسین، ''کایاکلپ''، مشمولہ: ''جنم کہانیاں''، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2011)، ص۴۲۲
4. گوپی چند نارنگ، ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲) ، ص۵۳۹
5. انتظار حسین، ''پرچھائیں''، مشمولہ: ''جنم کہانیاں''، ص۳۹۸
6. انتظار حسین، ''سفر منزلِ شب''، مشمولہ ''خیمے سے دور''، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1986) ، ص۲۳
7. ۔سجاد باقر رضوی، ''دیباچہ۔ آخری آدمی"، (دہلی، انڈیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1993) ، ص13
8. انتظار حسین، ''سیڑھیاں''، مشمولہ: ''شہر افسوس''، (لاہور، مکتبۂ کارواں، 1977)، ص۸۱۔۸۲
9. انتظار حسین، ''دیوار''، مشمولہ: ''کچھوے'' (،لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز ،۲۰۱۱)، ص۱۱۸
10. انتظار حسین، ''چیلیں''، مشمولہ: ''قصّہ کہانیاں''، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸)، ص۵۹۹
11. انتظار حسین، ''دیوار'' ، مشمولہ: ''قصّہ کہانیاں''، ص۱۳۵۔۱۳۶
12. انتظار حسین، ''اندھی گلی''، مشمولہ: ''شہر افسوس''، ص۲۴۶
13. انتظار حسین، ''شہر افسوس''، مشمولہ:"''شہر افسوس''، ص۲۷۰
14. انتظار حسین، ''شہادت''، مشمولہ: ''جنم کہانیاں''، ص۴۶۳
15. انتظار حسین، ''نرناری''، مشمولہ: ''خیمے سے دور'' ، ص۵۳
16. گوپی چند نارنگ، ''علامتی / تمثیلی کہانی'' ، مشمولہ: ''انتظار حسین ایک دبستان''، جلد دوم، (مرتبہ) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1996)، ص۴۹۷
17. ۔انتظار حسین، ''پرچھائیاں''، مشمولہ: ''جنم کہانیاں''، ص۴۰۱
18. نذیر احمد، "انتظار حسین کے افسانے-ایک مطالعہ"، مشمولہ: "نیا دور"، کراچی، شمارہ 47۔48، ص76
19. انتظار حسین، ''برہمن بکرا''، مشمولہ: '' قصّہ کہانیاں'' ، ص۵۰۴